مِلّت کے دِفاع کا مسئلہ

شریعت کی روشنی میں

موجودہ حالات میں تحفظ ملت
اور اپنے دفاع کے مسئلہ پر
جب غور کیا جاتا ہے تو کئی مسائل
اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس مختصر
کتابچہ میں انہیں مسائل کا شرعی
نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا
ہے

قلم

عَبدالعَلیمُ اِصلاحیؔ

Rs. 5.00

ناشر

اَلاُقصیٰ سَعِیدُ ابادُ حَیدرابادُ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

موجودہ صورتِ حال

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات انگریزی دورِ حکومت میں بھی ہوتے تھے۔ لیکن آزادیٔ ہند کے بعد فسادات کے عنوانات میں اضافہ ہوا، نوعیت اور شدت میں اضافہ ہوا اور تعداد میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ ایک عام سروے کے مطابق تقسیم ملک کے بعد تقریباً دس ہزار فساد ہو چکے ہیں باوجود اس کے کہ قومی یکجہتی پیدا کرنے کی کوششیں برابر ہوتی رہی ہیں۔ اب صورت حال انتہائی سنگین ہو گئی ہے۔ مسلم دشمنی کی انتہا کا یہ عالم ہے کہ راجیو گاندھی حکومت اور وی۔ پی سنگھ کو زوال کا منہ صرف اس لئے دیکھنا پڑا کہ مسلم دشمن طبقہ کے خیال میں یہ دونوں حکومتیں مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی اپنائے ہوئے تھیں۔ جبکہ راجیو گاندھی کی حکومت میں عدالتی حکم کے ذریعہ بابری مسجد پوجا پاٹ کے لئے کھول دی گئی اور مسجد کے بازو میں موقوفہ زمین پر مندر کی بنیاد رکھی گئی۔ اور وی۔ پی سنگھ کی حکومت میں پولیس اور نیم فوجی کمپنیوں کی موجودگی میں بابری مسجد کو نقصان پہنچایا گیا اور مسجد کے مینار پر بھگوا جھنڈا لہرایا گیا۔ اور ساتھ ہی اس حکومت نے بھی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے کوئی گنجائش نہیں پیدا کی۔ اس کے بعد تیسری حکومت چندر شیکھر حکومت کو کھلے طور پر دھمکی دی جا رہی ہے کہ اگر تم نے مسلمانوں کو خوش کرنے کی روش اختیار کی تو تمہاری موت بھی یقینی ہے۔

بی۔ جے۔ پی لیڈر مسٹر اے بزیدر سابق ایم ایل اے نے شادنگر میں ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے مرکزی حکومت پر الزام عائد کیا کہ اقلیتوں کی خوشنودی کی خاطر مسئلہ بابری مسجد رام جنم بھومی کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہی ہے راجیو گاندھی اور وی پی سنگھ حکومتوں کے خاتمہ کے اسباب بتلاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان حکومتوں نے اقلیتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، انہوں نے مرکزی حکومت کو انتباہ دیا کہ وہ اقلیتوں کو خوش کرنے کی پالیسی ترک کردے ورنہ اس کا وہی حشر ہوگا ____ جو ماضی کی حکومتوں کا ہوچکا ہے (روزنامہ منصف)

اس دھمکی کے ساتھ ایک دوسرا دھمکی آمیز دعویٰ سنئے۔ ایک لیڈر صاحب کہتے ہیں "اقلیتوں کی حفاظت حکومت نہیں کرسکتی، ان کی حفاظت صرف اکثریت کرسکتی ہے"۔ گویا اقلیتوں کو انتباہ دیا جارہا ہے کہ حکومت پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں اگر انہیں محفوظ رہنا ہے تو اکثریت کی منشاء کو سمجھیں اور اس کا لحاظ کریں۔

فساد نہیں دو قومی جنگ

اس صورت حال پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں کہ اب ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے فرقہ وارانہ فساد کہنا اور سمجھنا ایک بہت بڑی نادانی ہوگی۔ اور اگر دوسرے لوگ اس کو فرقہ وارانہ فساد کہتے ہیں تو ان کی طرف سے ایک کھلی حقیقت کو جھٹلانے اور مسلمانوں کو دھوکہ میں رکھنے کے ہم معنی ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کا اطلاق کسی وقتی اور جذباتی واقعہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی گڑبڑ پر ہوتا تھا جس کے پیچھے نہ کوئی سیاست ہوتی اور نہ کوئی سازش بلکہ جیسے دو پڑوسیوں میں کسی بات پر ہاتھا پائی ہوجاتی ہے اور

شام تک معاملہ ٹھنڈا ہو گیا، وربات آئی گئی ہو گئی، لیکن اس کے برخلاف اس وقت آل انڈیا پیمانہ پر منظم کئی تنظیموں کے بنائے ہوئے منصوبوں کے تحت ایک خاص مقصد کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اس مقصد کو ایک جملہ میں یوں ادا کیا جاتا ہے:۔

"مسلمان کے لئے دو ہی استھان پاکستان یا قبرستان"

یعنی مسلمانوں کو یا تو ہندوستان سے نکال دیا جائے یا پھر انہیں زندہ دفن کر دیا جائے۔ مسلمان بن کر یا اپنے جملہ تشخصات کے ساتھ انہیں ہندوستان میں رہنے نہیں دیا جائے گا۔ یہ نعرہ کسی ایک بستی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے کونے کونے میں لگایا جا رہا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منصوبہ ایک ہمہ گیر منصوبہ ہے۔ اس نعرہ کو سن کر نہ کسی انتظامیہ کو حرکت میں آتے دیکھا گیا اور نہ کسی عدلیہ کے کان پر جوں رینگی۔

ان وجوہ کی بناء پر اس صورت حال کو فرقہ وارانہ فساد کے بجائے مسلمانوں کی نسل کشی کی مہم اور ایک قوم کے اوپر دوسری قوم کی مسلط کی ہوئی جنگ قرار دینا زیادہ صحیح ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ اس جنگ میں اکثریتی طبقہ کا ایک بہت ہی چھوٹا طبقہ شریک ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کیونکہ ۸۰ کروڑ میں سے ایک کروڑ بھی اس مہم پر لگا ہوا ہے تو وہ کافی ہے ما باقی ۷۹ کروڑ یت پناہ بنا ہوا ہے یا خاموش ہے۔ اس جنگجو دل اور سینا کے خلاف انگلیوں پر گننے کے لائق تعداد

بھی نہیں ہوگی جو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہی صورت حال تاریخ کے ہر دور میں ہونے والی جنگوں میں آپ کو نظر آئے گی۔ اس لئے کہ کبھی بھی کسی جنگ کے لئے پوری قوم میدان میں نہیں اترتی، اکثریت پیچھے سے تائید کرتی ہے۔ یا تماشائی ہوتی ہے۔ اس لئے اس موقع پر یہ کہہ کر معاملہ کو ہلکا نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فتنہ اٹھانے والے مٹھی بھر ہیں اور اکثریت خیر پسند ہے۔

حکومت کا رول

کہنے کے لئے ہندوستان کا ایک دستور ہے اور اس کی روشنی میں تفصیلی قوانین ہیں جن کے مطابق ملک کا سارا کاروبار چلایا جاتا ہے۔ اور حکومت سیکولر ہے جو کسی ذات پات اور مذہب کے ساتھ جانبداری اور تعصب سے کام نہیں لیتی۔ اور ہر ایک کو مذہبی آزادی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری سیکولر حکومت اس جنگ میں کیا رول ادا کر رہی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ، ان کی زبانوں کے ساتھ، ان کے بڑے بڑے اداروں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ عام سیول اور فوجی شعبہ جات میں مسلمانوں کے تعلق سے کیا رویہ اختیار کیا گیا۔ ۹ ہزار سے زیادہ فسادات میں ہزاروں بچے یتیم ہوئے، ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں ہزاروں ماں باپ نے اپنے بچوں کو خون میں لت پت اور آگ میں جھلسا ہوا دیکھا لیکن اس سیکولر حکومت نے دو چار مجرمین کو بھی سزائے موت دے کر انہیں ان کے کیفر کردار تک نہیں پہنچایا بلکہ اس کے برعکس یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ان جنگجوؤں کی صرف پشت پناہی نہیں بلکہ ان کی معاونت سرکاری مشنری نے

کی ہے، اور مسلمانوں کو زبردست جانی و مالی نقصانات اسی وقت ہوئے ہیں جب پولیس اور نیم فوجی کمپنیوں نے بحالی امن و امان کے لیے کارروائی کی ہے آزادی کے بعد سے سینکڑوں مسجدیں غیر مسلموں کے زیر تصرف ہیں جن کو چالیس سال کے اندر سیکولر حکومت آزاد نہ کرا سکی۔ بابری مسجد میں بتوں کی پوجا عدالتی فیصلہ کے تحت ہو رہی ہے۔ اور عدالتی فیصلہ کی رو سے کوئی مسلمان نہ اس میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے، ان وجوہ کی بناء پر حکومت کا وجود موجودہ حالت کو دو قومی جنگ قرار دینے کے لئے مانع نہیں ہو سکتا۔

اس دو قومی جنگ کا ایک بڑا عنوان اور بڑی علامت "بابری مسجد" بن گئی ہے۔ وشوا ہندو پریشد، بجرنگ دل، بی جے پی اور شیو سینا ایک طرف اور دوسری طرف مسلمان قوم ہے۔ جنگ کی صورت یہ بنتی ہے کہ ایک طرف سے ایک مجمع اٹھتا ہے، لوٹتا ہے، آگ لگاتا ہے اور قتل کرتا ہے۔ اس کا مقابلہ دوسری طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم اس کی نوبت آتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ دونوں طرف سے ڈھکے چھپے گلیوں میں اور سڑک کے نکڑوں پر چاقو زنی ہوتی ہے۔ اس جنگ میں عام مسلمانوں یا مسلمانوں کی کوئی تنظیم دفاع نہیں کرتی بلکہ مسلمانوں میں سے ایک ایسا طبقہ اس میدان میں دفاع کر رہا ہے جو اپنی تعلیم، ذہنی سطح اور مذہبیت کے لحاظ سے انتہائی کم درجہ رکھتا ہے۔ بقیہ اونچے اور اوسط درجہ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کا ایک آدمی شہر کے مغربی کنارہ پر مارا گیا تو دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو شہر کے مشرقی کنارہ پر جا کر مارنا گناہ اور شرع کے خلاف ہے۔

کیونکہ وہ بے قصور ہے ۔

مگر ۳۰ر اکتوبر ۹۰ء کے بعد کے حالات اور واقعات نے مسلمانوں کے سنجیدہ لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھدیا ہے اور ان کے سامنے یہ سوال لا کھڑا کیا ہے

چند سوالات

کہ مسلمان کیا کریں ؟ اور اس ضمن میں مندرجہ ذیل سوالات اٹھائے جا رہے ہیں :

۱) ایک جگہ مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا جائے تو اس کے جواب میں کیا دوسری جگہ پر دوسرے فریق کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے ؟

۲) ایک مسلمان کو مار دیا جائے تو کیا دوسرے فریق کے کسی فرد کو مارا جا سکتا ہے ۔

۳) کیا موجودہ آئین اور قانون کی خلاف ورزی کرنے کی گنجائش شرعاً پائی جاتی ہے ؟

۴) کیا کوئی خفیہ کارروائی کی جا سکتی ہے ۔ ؟

۵) کیا اس جنگ کو جہاد کہا جا سکتا ہے ؟

ان سوالوں کے دو جواب ہیں دو نقطہ نظر سے ۔

پہلا نقطہ نظر

ایک نقطہ نظر سے جواب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ازروئے شرع جائز نہیں ہے اس لئے کہ اسلامی شریعت میں ہر جان کو محترم ٹھیرایا گیا ہے اور ہر کسی کا مال بھی محترم ہے جس کو ناجائز طریقہ سے ہاتھ لگانا حرام ہے ۔ اور مسلمان جس حکومت میں بھی ہو اس کے قانون کی پابندی کرنا شرعاً ضروری ہے اور کسی کے خلاف کوئی

خفیہ کارروائی تو دور کی بات ہے کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے سرگوشی کرنا بھی منع ہے۔ کسی بے گناہ پر ہاتھ اٹھانا گناہ عظیم ہے۔ شرعی اعتبار سے بدلہ لیا جا سکتا ہے لیکن اسی سے جس نے قصور کیا ہو اور اتنا ہی جتنا اس نے نقصان کیا ہو۔ ایک کا دوسرے سے اور ایک تھپڑ کی جگہ دو تھپڑ مارنے کی اجازت نہیں ہے اور جہاد کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ جہاد کے لئے ایک ضروری شرط امیر المومنین کی اجازت ہے۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی امیر ہی نہیں ہے تو اس کی اجازت کا کیا سوال۔ اس لئے ہندوستان میں جہاد نہیں ہو سکتا۔ اور حالات اس قدر سنگین نہیں ہیں کہ اس قسم کے سوالات اٹھائے جائیں۔ اور ان پر شرعی نقطہ سے غور کیا جائے۔

دوسرا نقطۂ نظر دوسرے نقطۂ نظر کی ترجمانی یوں کی جاتی ہے کہ حالات اس سے بھی زیادہ سنگین اور نازک ہیں جتنا کہ لفظوں میں ہم بیان کرتے ہیں۔ بلراج مدھوک سے لے کر اڈوانی اور اشوک سنگھل کے بیانات پر غور کیجئے، آر ایس ایس اور شیوسینا کے ساتھ وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے دس لاکھ والنٹیرس کی بھرتی پر نظر کیجئے۔ جبل پور کے واقعات کا سلسلہ حالیہ کرنل گنج، گونڈا اور بجنور کے المناک حادثات سے جوڑ کر دیکھئے اور پھر کمپیوٹر کی مدد سے نتیجہ نکالئے اور اس کے بعد بھیونڈی کے انصاری باغ والوں کی رائیں معلوم کیجئے، مراد آباد کے ان والدین سے پوچھئے جنہوں نے اپنے بچوں

کو عید کے نئے جوڑے پہنا کر عید گاہ روانہ کیا تھا اور چند ہی لمحوں بعد پی اے سی کے جوانوں نے خاک و خون میں انہیں تڑپا دیا۔ میرٹھ کے ان بیواؤں کا تاثر معلوم کیجیے جن کے جوان شوہروں کو ٹرک میں بھر کر پولیس لے گئی اور ایک ندی کے کنارے انہیں گولیوں سے بھون ڈالا۔ پھر بھاگلپور، کرنل گنج کے دیہاتیوں سے سنگینی حالات معلوم کیجیے جن کے بچوں کی لاشیں کئی کئی دن تک کھیتوں میں پڑی رہیں اور انہیں کوئی اٹھانے والا نہیں تھا۔ اور ساتھ ہی حیدرآباد کے اطراف ان درجنوں مسجدوں کو دیکھیے جن کو ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں منہدم کرنے کی کوشش کی گئی۔ جائے نمازوں کو جلایا گیا اور قرآنی نسخوں کی بیحرمتی کی گئی۔ کیا ہم حالات کی سنگینی اور نزاکت اس وقت محسوس کرینگے جبکہ ملک میں پوری مسلم آبادی کو بھاگلپور اور کرنل گنج بنا دیا جائے گا اور کیا شرعی نقطۂ نظر سے حالات کا جائزہ اس وقت لیں گے جب کہ وقت نکل چکا ہوگا۔

حالت جنگ کا مفہوم

حالت جنگ کا مفہوم اور معنی کیوں ایک لگا بندھا ذہنوں میں اٹکائے ہوئے ہیں ذرا غور کیجیے ایک حالت جنگ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مشرکین مکہ کی نسبت سے تھی اور ایک منافقین اور مدینہ کے یہود سے تھی۔ خلفاء راشدین کے دور میں بھی مختلف ملکوں سے ——— مختلف قسم کی حالت جنگ تھی۔ پوری اسلامی تاریخ میں کہیں یہ ثابت نہیں

ملے گی۔ اپنے ملک میں دیکھئے ایک صدی کے اندر کیسے کیسے حالات بدلے ہیں۔ اور علماء نے کس طرح مسائل پر سوچا ہے اور نتائج اخذ کئے ہیں اور اس کے مطابق حکمت عملی اپنائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز، مولانا اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی اور مولانا محمود الحسن، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ وغیرہم نے اپنے کو حالت جنگ میں سمجھ کر اقدامات کئے ہیں۔ آج فلسطین اور افغانستان میں علماء اہل حق جو کچھ کر رہے ہیں اپنے کو حالت جنگ میں سمجھ کر کر رہے ہیں۔ جن کی جرات اور پامردی کی آج ہم اپنی آرام گاہوں میں بیٹھ کر داد دیتے ہیں، اس کے پیش نظر ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ہم جس حالت جنگ میں گھرے ہوئے ہیں وہ اپنی ایک خاص نوعیت رکھتی ہے۔ ہم کو اسی کو بنیاد بنا کر سوچنا ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتوں کا ذکر کرنا ہے۔ ہم نے انگریزوں کے بالکل آخری دور میں ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت ہمیں بتایا جاتا تھا کہ انگریزوں کو ہر طرح نقصان پہنچانا جائز ہے، حتیٰ کہ بغیر ٹکٹ ٹرین میں سفر کرنا جائز کہا جاتا تھا۔ دوسری بات ریشمی رومال کی تحریک ہے جو ایک خفیہ کارروائی تھی جو برٹش گورنمنٹ کے خلاف کی گئی تھی۔ علماء نے یہ طرز فکر صرف اس لئے نہیں اختیار کیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہیں بلکہ اس لئے کیا تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، جن کے خلاف جنگ کرنا مسلمان کا فریضہ ہے۔

حالت جنگ کی خصوصیت

حالت جنگ میں کسی کی جان اور مال محترم نہیں رہتے

اور نہ یہ اصول باقی رہتا ہے کہ جس نے میرے بھائی کو مارا ہے اسی کو میں ماروں اور جس نے میرا مال لیا ہے اسی سے میں بدلہ لوں، بلکہ دشمن قوم کا ہر فرد دشمن ہے بالخصوص وہ فرد جو جنگجو ہو۔ اس وجہ سے ہندوستان میں جو لوگ تین ہزار مساجد کو اپنے نشانہ میں رکھتے ہیں اور جو لوگ مسلمانوں کو پاکستان بھیج دینا چاہتے ہیں یا پھر ختم کر دینا چاہتے ہیں ان کے مجموعہ کو ہم دشمن کیوں نہ قرار دیں۔ یہ کہنا کہ یہ حکم دینی جنگ میں ہوتا ہے، قومی جنگ میں نہیں۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ قومی اور دینی کا کوئی سوال نہیں ہے، جب ایک گروہ کا مقابلہ دوسرے گروہ سے ہوگا یہی حکم لاگو ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ دینی جنگ کیوں نہیں ہے کہ اگر مسلمان اپنی مسلمانیت کی شناخت ختم کر دیں تو یہ جنگ ختم ہو جائے گی، ساری لڑائی اسلام اور مسلمانیت کی شناخت سے وابستگی کی بنا پر ہے، غور کیجئے ایک گروہ سے نہ ہمارا زمین جائیداد کا جھگڑا ہے نہ لین دین کا، لیکن ہماری آبادی پر حملہ آور ہوتا ہے یا انفرادی طور سے ہمارے افراد پر حملہ کیا جاتا ہے ہماری مسجد کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر ایک مسجد کو منہدم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت اور دلیل ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں جنگ میں مصروف ہے۔

ایک اہم سوال کے تین جواب

اس مقام پر یہ سوال خود بخود ہمارے سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں ہماری کیا حکمت عملی ہونی چاہیئے۔ اس کے جواب میں ایک بات یہ کہی جاتی

جا سکتی۔ ہے کہ مسلمان کچھ نہ کریں، حکومت اور اکثریتی طبقہ پر بھروسہ کریں۔ اور دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں، اس لئے کہ سب کے خون سفید نہیں ہو گئے ہیں۔ ہمارے کچھ اقدام کرنے سے حالات مزید ابتر ہو جائیں گے اور پھر نقصان ہمارا ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس حکمت عملی کے کچھ مفید نتائج نکلیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ یہ حکمت عملی اپنائیں گے انہیں نہ اللہ تعالیٰ معاف کریں گے اور نہ تاریخ معاف کرے گی اور نہ ہماری آئندہ نسلیں بخشیں گی، کیونکہ اس کے معنی ہوں گے کہ گزشتہ چالیس سال کے واقعات اور حادثات سے گویا کوئی عبرت نہیں حاصل کی گئی اور ایک بل سے بار بار ڈسوانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں۔

ایک دوسری رائے یہ ہو سکتی ہے اور کچھ لوگ پیش بھی کرتے ہیں کہ سب کچھ برداشت کر لیا جائے لیکن تصادم کی راہ نہ اپنائی جائے، اس غرض کے لئے کہ دعوت و تبلیغ کی راہ کھلی رہے۔

قابل غور تین پہلو

لیکن یہ بھی کوئی محفوظ اور اپنی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہونے کی راہ نہیں ہے۔ اگر دفاع کی راہ نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی تو مستقبل قریب میں اس کا سخت اندیشہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کی راہیں بالکل بند کر دی جائیں۔ اور قولی اور تحریری ہر طرح کی دعوتی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی جائے اور آپ کو ایسا بے بس کر دیا جائے کہ آپ مطلق ہاتھ پیر مارنے کے قابل ذہن تیار نہ ہو، اور عملی میدان میں بھی کچھ تیاریاں نہ ہوں اس وقت تک مقابلہ نہیں کیا جا سکتا بالخصوص جبکہ ہوا کا رخ یہ بتا رہا ہے کہ آئندہ الیکشن

سیاست بھی زیادہ موثر نہ رہ جائے گی اور اگر رہے گی تو بیلٹ بلٹ کے زیرِ سایہ رہے گا۔ آسام، کشمیر اور پنجاب اور آندھرا پردیش کے بعض علاقوں سے آنے والی ہواؤں کا یہ کھلا اشارہ ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ واقعی دعوت یعنی دعوت توحید دی جائے تو کیا تصادم کی فضا مزید تیزی اور شدت کے ساتھ نہیں بنے گی۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کی راہ میں تصادم سے نہیں بچ سکے تو آج کے دور میں دعوت و تبلیغ کا وہ کونسا طریقہ اپنایا جا سکتا ہے جس سے صرف محبت اور بھائی چارہ ہی کی فضا پیدا ہوگی، اور دار و رسن اور ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گریز کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں وہ کیا دلائل ہیں کہ آپ مدافعت کی استطاعت رکھتے ہوئے بھی مدافعت نہ کریں تو اللہ کی بازپرس سے بچ جائیں گے۔ ایک ایسا جوان جو قوت و طاقت اپنے جسم میں رکھتا ہے اپنے مال کی اپنی جان اور آبرو کی حفاظت کے لئے حرکت نہ کرے تو شریعت سے پوچھئے کہ اللہ اور رسول کے پاس اس کی کیا حیثیت قرار پاتی ہے۔ اس کے مسلم پڑوسی کی جان اور آبرو پر حملہ کیا جا رہا ہو اور وہ جنبش نہ کرے، تو کیا اس کے ایمان کو خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ محلہ کی مسجد کو کچھ لوگ منہدم کرنا چاہتے ہیں اور نمازیوں کو نماز سے روکیں اور ایک توانا مسلم نوجوان کے کان پر جوں تک نہ رینگے تو کیا اس کی مسلمانیت میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ الغرض اقدام اور دفاع کے لئے قرآن و سنت میں جہاد کے نام سے جو ہدایات اور تعلیمات

موجود ہیں، ان کے ہوتے ہوئے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی کہ دعوتی مقاصد کی خاطر اپنی حفاظت اور مدافعت کی بات نہ سوچی جائے اور نہ عملاً کچھ کیا جائے، اور اگر کوئی کھینچ تان کر بات بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کھینچ تان کر ایسے بے شمار دلائل بھی اکٹھا کیئے جا سکتے ہیں کہ دعوت و تبلیغ کی اب ضرورت ہی نہیں ہے حق کھل کر آچکا ہے، جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ لہذا یہ دوسرا طرز فکر بھی نہ قرین عقل و دانش ہے نہ مطابق دین و شریعت

صحیح جواب اس کے بعد صرف ایک ہی راہ رہ جاتی ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ حفاظت اور دفاع کی راہ اپنائی جائے اور اس کا حق ادا کیا جائے۔ اور "اَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" کا تقاضا پورا کیا جائے۔ اور ان دو چیزوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا:
"اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" کے زمرہ میں داخل ہوگا۔ اور "لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ" کی ہدایت کے خلاف ہوگا۔

دعوت اور دفاع دونوں کا ہماری حکمت عملی میں شامل ہونا ایک پہلو سے اور بھی ضروری اور اہم ہے کہ جس طرح کہ ۲۳ سال کے عرصہ میں نزول وحی اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں دین اسلام مکمل ہوا ہے اسی طرح دین و ملت کی خدمت، بقاء، حفاظت اور دفاع کے لئے طریقہ اور حکمت عملی شرعی طور سے متعین کی گئی ہے اس کا نام جہاد ہے اور جہاد کے دو شعبے ہیں یا یہ کہا جائے

کہ دو جز ہیں، ایک "دعوت" اور دوسرا "دفاع اور قتال"۔
فقہ کی مشہور کتاب "فتاویٰ عالمگیری" میں ہے :-

فَالْجِهَادُ هُوَ الدُّعَاءُ إِلَى الدِّيْنِ الْحَقِّ وَالْقِتَالُ مَعَ مَنِ امْتَنَعَ وَتَمَرَّدَ عَنِ الْقُبُولِ إِمَّا بِالنَّفْسِ أَوْ بِالْمَالِ۔ "کتاب السیر"	پس جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا اور ان کے ساتھ جان یا مال کے ساتھ جنگ کرنا ہے جو کنارہ کشی اختیار کریں اور قبول حق کے مقابلہ میں سرکشی کریں۔

"جہاد باعتبار لغت جَاهَدَ فِي سَبِيْلِ اللهِ کا مصدر ہے اور باعتبار شرع دین حق کی طرف دعوت دینا اور دین حق قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔" شمسی بحوالہ الدار المختار"

جس طرح حسب استطاعت پورے دین کو ماننا اور اپنانا ضروری ہے اسی طرح شرعی طور سے متعین کردہ حکمت عملی "جہاد" کو بھی استطاعت کے مطابق ضروری شرائط کی موجودگی میں اپنانا ضروری اور تقاضائے دین وایمان ہے۔ لیکن جہاد کا موضوع آتے ہی غور وفکر کا دائرہ محدود ہی نہیں تقریباً بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جہاد کے لئے امیر کی اجازت ضروری شرط ہے۔ اور جب ہندوستان میں ہمارا کوئی امیر نہیں تو جہاد کا کوئی سوال۔

مگر اس مسئلہ کی گہرائی میں جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت وہ نہیں ہے جو عام طور پر عوام تو عوام اچھے خاصے لوگ سمجھتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ علماء ہند کو اس مسئلہ پر زیادہ سے زیادہ سوچنے اور

کام کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ چنانچہ ہندوستان میں جتنی فقہی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں جہاد کا باب عام طور سے ہوتا ہی نہیں جبکہ سلطنت مغلیہ کے زوال سے پہلے کی کتابوں میں جہاد کا باب کتب فقہ میں برابر ملے گا۔ البتہ موجودہ دور میں جن علاقوں کے مسلمان دشمنان دین سے کشمکش کر رہے ہیں، ان کے یہاں جہاد موضوع گفتگو بنا ہے اور ان کی نظر اس عنوان پر زیادہ گہری پڑی ہے۔

درحقیقت جہاد کی فرضیت کے لئے امیر کا ہونا ضروری نہیں ہے جس طرح فرضیت نماز کے لئے امام کا ہونا شرط نہیں ہے، البتہ استثنائی حالات کے علاوہ جس طرح عام قاعدہ یہ ہے کہ فرض نماز کسی امام کی امامت میں ادا کی جاتی ہے اسی طرح عام قاعدہ یہ ہے کہ جہاد کسی امیر المومنین کے تحت ہونا چاہیئے اور یہ امر واقعہ ہے کہ جب بھی جہاد ہوا ہے مسلمانوں کے دور عروج میں ہوا ہے جبکہ مسلمان کسی امیر المسلمین کے تحت ہی زندگی گزار رہے ہوتے تھے ایسی صورت میں امیر المومنین کے حکم اور اجازت کے بغیر جہاد کا ہونا کیسے متصور ہو سکتا تھا۔

دو جواب طلب سوال

اس مقام پر دو سوال جواب طلب ہیں

(۱) امیر المومنین کے ہوتے ہوئے اگر کچھ لوگ بغیر اجازت جہاد کریں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اور جہاں امیر المومنین نہ ہوں وہاں کیا جہاد کی کوئی صورت ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں ہم فقہ کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں :۔

"اگر دار الحرب میں ایسی جماعت داخل ہوتی ہے جسے قوت دفاع حاصل تھی یعنی طاقتور جماعت تھی تو ان سے بیت المال کے لئے خمس لیا جائے گا اگرچہ یہ جماعت بادشاہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوتی ہو" (فتاوی عالمگیری)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر اس جماعت کا دھاوا بولنا صحیح تسلیم کیا گیا، اور اس کو جہاد قرار دیا گیا۔ اس کے برخلاف اگر ایک دو آدمی دار الحرب میں جائیں تو ان سے خمس نہیں لیا جائے گا اس لئے کہ وہ مال غنیمت کی تعریف میں نہیں آئے گا۔ اور ان کا دھاوا بولنا جہاد متصور نہ ہوگا۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ فقہی تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کا عمل جہاد کی تعریف میں نہیں آتا اور ان کا دھاوا بولنا جہاد متصور نہ ہوگا لیکن ان کا چھین جھپٹ کر لایا ہوا مال ان کے لئے حلال ہوگا، حرام نہ ہوگا۔

بہر حال اوپر مذکورہ دونوں فقہی جزئیوں پر غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ امیر المومنین کے ہوتے ہوئے بھی اس کی اجازت کے بغیر جہاد ہو سکتا ہے، اور دوسری بات یہ کہ جہاد کے صحیح ہونے اور نہ ہونے میں قوت طاقت اور قوت دفاع کی موجودگی بھی ایک معیار ہے۔ ھدایہ کی شرح فتح القدیر جلد سابع میں ہے کہ "شریعت میں وہ زور اور جبر معتبر ہے جو

سلطان کی طرف سے ہو کیونکہ سلطان کو قوت دفاع اور قوت منعہ حاصل ہے اور جس کے پاس قوت دفاع نہ ہو اس کی جانب سے زور اور طاقت کے استعمال کو شریعت نے معتبر نہیں قرار دیا ہے"۔

سلطان کی تعریف شامی جلد۵ میں پڑھیے:۔

" شریعت نے سلطان کے بغیر کسی کا زور اور جبر معتبر نہیں مانا ہے، کیونکہ زور جبر کی طاقت قوت دفاع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور جس کے پاس قوت دفاع ہو وہ سلطان ہے۔

قوت دفاع کا معیار کیا ہے، یعنی کب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب قوتِ دفاع حاصل ہو گئی، اس مسئلہ پر کتب فقہ کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے روشنی پڑتی ہے:۔

"دو تین آدمیوں کا حکم بھی ایک کا ہے البتہ چار ہوں تو خمس لیا جائے گا۔ محیط میں ابو یوسف سے منقول ہے کہ سات آدمیوں کی جماعت ازروے شریعت وہ جماعت نہیں ہے جس کو قوتِ دفاع حاصل ہو۔ دس آدمیوں کی جماعت ایسی جماعت ہے جس کو قوت دفاع حاصل ہو گی"۔ (فتح القدیر۔)

عنایہ میں قوت منعہ کی تفسیر سریہ سے کیا ہے، اس تفسیر کو علامہ ناطقی نے ابن شجاع کی کتاب الخراج سے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں اگر کوئی ایک آدمی اکیلا دار الحرب میں داخل ہو اس حال میں کہ دار الحرب میں کہیں قریب اسلامی فوج نہ تھی پھر اس آدمی کو

کچھ مال ہاتھ آیا تو اس میں بیت المال کا پانچواں حصہ نہ ہوگا،
یہاں تک کہ مسلمان حملہ آوروں کی تعداد ۹ تک پہنچ جائے،
جب نو تک تعداد پہنچ جائے تو یہ سریہ ہے لہذا اسمیں خمس ہوگا۔"

جہاد کے لئے ضروری تعداد

معلوم ہوا کہ کفار کے مقابلہ میں ۹-۱۰ افراد پر مشتمل کوئی جتھا یا ٹولی ہو تو شرعاً اسے باعتبار قوت، قوتِ دفاع کا حامل کہا جا سکتا ہے اور وہ جو بھی اقدام کریں گے اس کو جہاد کہا جا سکتا ہے اور اس کے سربراہ کو امیر یا سلطان کہا جا سکتا ہے اور اسکی سرکردگی میں جہاد کیا جا سکتا ہے اور جہاں تک قوت دفاع کیلئے اسلحہ اور دیگر تیاریوں کا سوال ہے، اس کا جواب قرآن کے الفاظ مَا اسْتَطَعْتُمْ میں مل جاتا ہے پھر تینوں سوالوں کا جواب یعنی تعداد اسلحہ وغیرہ کی مقدار کیا ہو اور حدود اقتدار کیا ہو ابو جندل اور ابو البصیر کے واقعہ سے ملتا ہے:۔

حضرت ابو البصیر مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے، صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آئے ان کے پیچھے ہی مکہ سے ازہر بن عبد عوف اور اخنس بن شریق کا ایک مکتوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مدینہ دو آدمی لائے کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی رو سے ابو البصیر کو واپس کر دیا جائے۔ حضورؐ نے ابو البصیر کو بلایا اور فرمایا۔ "ابو البصیر ہم نے اس قوم سے جو عہد کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے دین میں عہد شکنی نہیں ہے۔ تم مکہ چلے جاؤ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ پیدا کرے گا۔"

ابوالبصیر نے عرض کیا یارسول اللہ کیا آپ مجھے مشرکوں کی طرف واپس کر رہے ہیں جو میرا دین برباد کر دیں گے۔ حضورؐ نے پھر فرمایا۔ "مکہ چلے جاؤ۔ اللہ کوئی راہ نکالے گا"۔ حضرت ابوالبصیر مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ لیکن راستہ میں انہوں نے مقام ذوالحلیفہ میں اپنے دونوں پہرہ داروں میں سے ایک کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا۔ دوسرا پہرہ دار ڈر کر مدینہ چلا گیا اور وہاں حضورؐ سے ابوالبصیر کی شکایت کی۔ اس کے بعد ساتھ ہی ابوالبصیر بھی مدینہ پہنچ گئے اور حضورؐ سے عرض کیا یارسول اللہ آپؐ کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ اس کے بعد ابوالبصیر مدینہ سے مقام عیص چلے گئے۔ عیص اس راستہ پر ہے جس سے ہو کر وہ شام جاتے تھے سمندر کے ساحل پر ذوالمرہ کے کنارے واقع ہے۔ مکہ میں جو مسلمان روکے ہوئے تھے وہ اس واقعہ سے واقف ہو چکے تھے اور حضورؐ نے جو کہا تھا اس کو جان چکے تھے اس لئے وہ عیص میں ابوالبصیر سے آکر مل گئے اس طرح تقریباً ستر آدمی جمع ہو گئے اور انہوں نے قریشیوں کا قافیہ تنگ کر دیا۔ وہ جس قریشی کو پاتے اسے قتل کئے بغیر نہ چھوڑتے اور جو قافلہ ان کے پاس سے گزرتا اس پر چھاپا مارتے۔

جس وقت حضرت ابوالبصیر اپنی کارروائی کر رہے تھے اس وقت مدینۃ الرسول دارالاسلام کا صدر مقام تھا جس کے سربراہ بذات خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ ابوالبصیر اپنے ساتھیوں کو لے کر جو کچھ کر رہے تھے حضورؐ کی اجازت اور حکم سے نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے طور پر کر رہے تھے ورنہ مشرکین ضرور اعتراض کرتے کہ حدیبیہ میں طے شدہ معاہدہ کی

یہ خلاف ورزی ہے پھر بھی آپ کو سب کچھ معلوم تھا جس پر آپ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی جبکہ یہ ناممکن ہے کہ خلاف شرع کوئی کام ہو رہا ہو اور آپ خاموش رہیں اسی لئے آپ کی خاموشی یعنی اقرار کو شریعت میں ایک مضبوط دلیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ پس آپ کی خاموشی حضرت ابوالبصیر کی ساری کارروائیوں کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، جو بہت ساری قیل وقال کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے کوئی حکمت عملی متعین کرنے کے لئے اس واقعہ کو بنیاد بنانا ہی درست ہے۔

موجودہ زمانے میں ابوالبصیر کا نمونہ

آج ابوالبصیر کے اس واقعہ کو دلیل بنا کر کوئی جتھا کسی جنگل، پہاڑ یا کسی مقام کو اپنا اڈہ بنا کر دشمنان دین وملت کو نشانہ بنالے تو کیونکر غلط ہو سکتا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ حضورؐ کے خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ یہ واقعہ دارالاسلام مدینہ کے باہر ہو رہا تھا اس لئے آپ نے اس سے تعرض نہیں فرمایا۔ تو یہ توجیہہ صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ کی رسالت اور نبوت ساری دنیا کے لئے تھی۔ دنیا میں جہاں کوئی مسلمان ہوگا آپ کے حکم کے تابع ہوگا۔ حضرت ابوالبصیر آپ کے حدود رسالت واطاعت کے باہر نہ تھے۔ اور اگر اس توجیہہ کو صحیح مان لیا جائے تو ہمارے مدعا کو مزید ثبوت اور قوت حاصل ہوگی اور یہ ثابت ہوگا کہ کہیں بھی چند مسلمان اکٹھا ہو کر دین وملت کے دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمانوں کی وسیع پیمانہ پر شرعی حکومت قائم ہو اور وسیع علاقہ پر امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کا سکہ جاری ہو۔

دوسرے سوال کا جواب

اب آئیے ہم دوسرے سوال پر غور کریں۔ یعنی جہاں کوئی امیر المومنین نہ ہو وہاں جہاد کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے جواب میں شامل ہے جس کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے۔ ہم زیادہ نظری بحث نہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ انعقاد جمعہ ونماز عیدین کے لئے بھی امام یا قاضی کی ضرورت ہے اور نکاح وطلاق کے نزاعی معاملات میں مسلم قاضی کا فیصلہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے جیسے ملک میں جہاں امیر نہیں ہے وہاں قاضی کہاں سے آئے گا۔ اور معاملات اور حادثات تو بہر صورت پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ اس مسئلہ کا حل علماء نے یہ نکالا کہ عام مسلمانوں کی جماعت کے فیصلہ کو قضاء قاضی کے برابر قرار دیا جائے اسی بنیاد پر پورے ملک میں جمعہ وعیدین کی نمازیں قائم کی جاتی ہیں۔ اور اسی بنیاد پر ملک کے کئی علاقوں میں شرعی پنچایتیں کام کر رہی ہیں۔

پھر اسی بنیاد پر شریعت میں امام اور امیر المومنین کی جو تعریف ہے اس کو محدود کرتے ہوئے پرسنل لا کی حد تک ایک امیر بنا لیا جائے اور وہ قاضی کا تقرر کرے اور وہ قاضی فیصل مقدمات کرے تو وہ فیصلہ شرعی فیصلہ تسلیم کر لیا جائے۔ امارت شرعیہ بہار اور امارت ملت اسلامیہ آندھرا پردیش اسی بنیاد پر قائم ہیں۔

ایک فقہی نقطہ

اس کی نظیر شریعت کے بہت سے احکام میں بھی مل سکتی ہے کہ فرض اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ اس

کی ادائیگی کے شرط نہ ہونے کی صورت میں فرض ساقط نہیں ہوتا مثلاً نماز کی ادائیگی کے لئے ستر پوشی ضروری شرط ہے لیکن ستر پوشی کا سامان نہ ملے تو وہ فرض ساقط نہ ہوگا بلکہ فرض ادا کیا جائے گا، کیسے ادا کیا جائے گا کسی مفتی سے دریافت کیجئے۔ وضو ادائیگی نماز کے لئے شرط ہے، لیکن پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم سے کام لیا جائے گا اور اگر کوئی ایسی صورت فرض کی جائے کہ تیمم کرنا بھی ممکن نہ ہو تو نماز کیسے ادا کی جائے کسی مفتی صاحب سے پوچھئے۔ بہر صورت نماز ادا کرنی ہوگی۔ فرض ساقط نہ ہوگا، البتہ بعض شکلوں میں فرض کی شکل بدل سکتی ہے۔

جماعت سازی کی بنیاد

سوال یہ ہے کہ نکاح اور طلاق کے جھگڑے طے کرنے کے لئے ایک ملک میں بحیثیت تیمم امارت قائم کی جاسکتی ہے تو فریضۂ جہاد کی ادائیگی کے لئے کوئی امارت کیوں نہیں قائم کی جاسکتی جو اصل امارت اور اسلامی حکومت کی نسبت سے ویسی ہی ہو جیسے ادائیگی نماز کے اصل وضو کی جگہ تیمم ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت نہیں ہے، کوئی ہمارا امیر نہیں ہے تو اس بنیاد پر قیامت تک جاری رہنے والے فرض جہاد کو اپنی ڈکشنری سے نکال دینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ اور اس کو کسی شکل میں اور کسی درجہ میں باقی نہ رکھنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اگر فریضۂ دعوت و تبلیغ کی ادائیگی کے لئے انجمنیں، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کل ہند پیمانہ پر امیر اور مامور کی اصطلاح میں بات کرسکتی ہیں اور اپنے دائرہ میں امیر کی اطاعت

کو دینی فریضہ سمجھتی ہیں اور ان کا سمجھنا بجا ہے تو فریضہ جہاد کو ادا کرنے کے لئے کوئی امارت کیوں نہیں بنائی جاسکتی اور اگر ایک ملک میں دعوت و تبلیغ اور اشاعت اسلام کے لئے کئی کئی تنظیمیں بنانا روا ہے تو فریضہ جہاد جیسے مہتم بالشان فریضہ کی ادائیگی کے لئے کوئی نظم کیوں نہیں قائم کیا جاسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جہاد کے لئے کسی شرعی بنیاد کی نفی جن مزعومات کے تحت کی جاتی ہے ان کو صحیح مان لیا جائے تو کسی کام کے لئے کوئی انجمن اور جماعت بنانے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ ساری انجمنیں اور جماعتیں اپنے اپنے کاموں کی اہمیت بتانے کے لئے اور اپنے کارکنوں میں جوش عمل پیدا کرنے کے لئے انہیں آیات اور احادیث اور انہیں مسلمات کو پیش کرتی ہیں جو صریح طور سے جہاد کے لئے قرآن و حدیث میں ہمیں ملتی ہیں۔ مگر جب جہاد کا نام لیا جاتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے گنجائش نہیں ہے۔

اقدام اور دفاع میں فرق

ایک پہلو مزید سوچنے کا یہ ہے کہ احکام اور شرائط کے اعتبار سے اقدامی جہاد اور دفاعی جہاد میں آپ کو فرق ملے گا۔ اقدامی جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے، لیکن دفاعی جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ اقدامی جہاد میں تعداد کا، جنگی سامان اور وسائل کا لحاظ اور اعتبار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقدامی جہاد میں کئی اور لوگوں سے اجازت لینی ہوتی ہے مثلاً غلام کو اپنے آقا کی اجازت درکار ہوگی، لیکن دفاع کے موقع پر نہ تعداد کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ وسائل جنگ کی کمی بیشی دیکھی جاتی ہے اور نہ کسی کو کسی سے اجازت لینے

کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ ہر ایک کو ہر حالت میں حسب استطاعت دفاعی جہاد میں شرکت کرنی ضروری ہوتی ہے۔ اسی بنار پر غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالک رضی اور ان کے دونوں ساتھیوں کو شریک جہاد نہ ہونے کی وجہ سے کیسی عبرتناک سزا دی گئی کہ پچاس دن تک ان سے نہ کوئی سلام وکلام کرتا نہ سلام کا جواب دیتا۔ اور ان کے لئے زمین تنگ ہو کر رہ گئی۔

قرآن میں دفاع کا ذکر

قرآن میں دفاع کا حکم صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ لیکن ایک نقطہ قابل لحاظ ہے۔

مکّی سورتوں میں حکم دفاع کے ساتھ دو باتوں کی صراحت کی گئی ہے، ایک ظلم سے بڑھ کر بدلہ نہ لیا جائے اور دوسرے یہ کہ صبر کرو تو بہتر ہوگا۔

مدنی سورتوں میں بغیر کسی قید و شرط کے حکم دفاع ہے بلکہ اقدام اور پہل کرنے

مکّی سورتوں میں:-

وجزآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثلها فمَنْ عفا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الظّٰلِمِيْن ○ (الشوریٰ ۴۰)	برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔
وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ○ (النحل ۱۲۶)	اگر تم بدلہ لے لو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

مدنی سورتوں میں:-

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرہ۔ ۱۹۰)	اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو۔
فَمَنِ اعْتَدٰى عليكم فاعْتَدُوا عليه بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ (البقرہ ۱۹۴)	جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح دست درازی کرو۔ البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ (الحج ۳۹)

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے

دفاع حدیث میں

۱۔ حضرت ابو موسیٰ کی روایت میں ہے کہ حضورؐ کو جب کسی قوم سے اندیشہ ہوتا تو دعا کرتے، اللّٰھم اِنا نجعلک فی نحورھم ونعوذبک من شرورھم (یعنی اے اللہ ہم ان کے مقابلہ میں تجھ کو کرتے ہیں اور ان کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔)

۲۔ حضرت ابو ہرہ کی روایت ہے آپؐ نے فرمایا: لَا تَتَمَنَّوا لِقَاءَ العَدُوِّ وَاسْئَلُوا اللّٰہَ العَافِیَۃَ فَاِذَا لَقِیتُمُوھُم فَاصْبِرُوا "دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اللہ سے عافیت مانگو لیکن مڈبھیڑ

ہو جائے تو ڈٹ جاؤ۔

۳۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا مَن قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْد "جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے"۔

۴۔ ابوداؤد اور ترمذی کی حدیث میں حضرت ابو الاعور سعیدؓ نے کہا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْد وَمَن قُتِلَ دُوْنَ دَمِہٖ فَھُوَ شَھِیْد وَمَن قُتِلَ دُوْنَ دِیْنِہٖ فَھُوَ شَھِیْد وَمَن قُتِلَ دُونَ اَھْلِہٖ فَھُوَ شَھِیْد "جو مارا گیا اپنے مال کی حفاظت میں وہ شہید ہے، جو مارا گیا اپنی جان کی حفاظت میں وہ شہید ہے اور جو مارا گیا اپنے دین کی حفاظت میں وہ شہید ہے اور جو مارا گیا اپنے اہل و عیال کی حفاظت میں وہ شہید ہے۔

۵۔ مسلم شریف کی حدیث ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیا ایک آدمی حضور کے پاس آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ کا کیا خیال ہے اگر ایک آدمی آئے میرا مال چھیننے کے لئے آپ نے فرمایا اس کو اپنا مال نہ دے، سائل نے عرض کیا اگر وہ مجھ سے جنگ کرے، فرمایا تو اس سے جنگ کر۔ سائل نے دریافت کیا اگر وہ مجھ کو قتل کر دے تو آپ نے فرمایا تو شہید ہو گا۔ پھر سائل بولا اگر میں اس کو قتل کر دوں تو آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا۔

۶۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے آپؐ نے فرمایا: مَن عُلِّمَ الرَّمْیَ ثُمَّ تَرَکَہٗ فَلَیْسَ مِنَّا اَوْ فَقَدْ عَصٰی "جس کو تیر اندازی سکھائی گئی پھر اس نے تیر اندازی چھوڑ دی وہ ہم میں نہیں یا اس نے نافرمانی کی۔

۷۔ ایک روایت میں حضورؐ کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ذریعہ تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ بنانے والا جو اس کے بنانے میں حصول خیر کی نیت رکھتا ہو تیر کو پھینکنے والا اور تیر کو اٹھانے والا۔ تیر چلاؤ اور سواری کرو اور تیر چلانا سواری کرنے سے بہتر ہے اور جس نے سیکھنے کے بعد بے رغبتی کی وجہ تیر اندازی چھوڑ دی تو اس نے ایک خاص نعمت کو ضائع کر دیا۔

۸۔ بخاری و مسلم کی حدیث ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "آپؐ نے فرمایا۔" اَلْحَرْبُ خَدْعَةٌ (جنگ دھوکہ ہے)

دفاع کی اہمیت

"الجہاد فی الاسلام" میں دفاع کی اہمیت بتاتے ہوئے مصنفؒ لکھتے ہیں:۔

"قرآن اپنے پیروں میں حمایت حق کی ایسی ناقابل تسخیر روح پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظت حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقتور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔۔۔۔ قرآن جو در حقیقت صحیفۂ فطرت ہے فطرت کے اس راز کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے، اسی بنا پر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں یا موت یا شرف۔ زندگیٔ بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی چاہے اس کے بدنصیب پیروؤں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلہ کی پستی سے اس کو خود اختیار کر لیا ہو۔۔۔ قرآن حکیم نے سب معاملات میں تحمل اور برداشت کی تعلیم دی

ہے مگر ایسے حملہ کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دین اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سوا دوسرا انتظام مسلط کرنے کے لئے کیا جائے۔ اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے تم پر ظلم وستم ڈھائے تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے، تم سے ایمان وضمیر کی آزادی سلب کرے، تمہیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکے، تمہارے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا چاہے اور اس وجہ سے تمہارے درپے آزار ہو کہ تم اسلام کے پیرو ہو تو اس کے مقابلہ میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنی پوری طاقت اس کے اس ظلم کو دفع کرنے میں صرف کرو.... ۶۱... دفاع کے ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ان دینی فرائض میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنے قومی استقلال کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں اور اپنے قومی اور دینی وجود کو کسی حال میں فتنہ سے مغلوب نہ ہونے دیں اس کے لئے اسلام نے اپنے پیروں کو جنگ کی محض اجازت ہی نہیں دی بلکہ تاکید کی ہے اور تاکید بھی ایسی سخت جس کی کیفیت اوپر بیان کی گئی ہے۔ مگر حملہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلان جنگ کرکے دارالاسلام پر حملہ آور ہو اور اس کو فتح کرکے مسلمانوں کو مٹانے یا غلام بنانے یا ان کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جن سے ایک قوم کے امن واطمینان اور اس کی اجتماعی زندگی کو خطرہ میں مبتلا کیا جاسکتا ہے.....

اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں ایک غائر نظر ڈالیئے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی مقصد کام کر رہا ہے اور وہ

یہ کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے خواہ باہر سے خواہ اندر سے اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں ۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اس کے لئے اولین ضرورت ان کا فتنوں اور رخنوں سے محفوظ رہنا اور ان کا قومی و سیاسی طاقت کا محفوظ رہنا ہے، اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان اجتماعی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنہوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا ۔ تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔ بس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے نشانات بتائے گئے ہیں، جو ان کی بربادی کا موجب بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں، اور ایک ایک کا دھڑ توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے اور عالم گیر اصلاح کے کام میں سدِ راہ بننے کے قابل نہ رہیں پھر اس کے لئے صرف اسی وقت تلوار اٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جب کہ بدی اپنا سر نکالے اور فتنہ پردازی شروع کر دے بلکہ اس کے مقابلہ پر ہر وقت کمربستہ و مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے ———————— تاکہ اسے سر نکالنے کی جرات ہی نہ ہو سکے اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا دف اندر ہی اندر ہی مر جائے ۔

ظالموں اور قاتلوں سے چشم پوشی کرنے والے حکمران ؛

جو ظالموں اور قاتلوں کو سزا نہ دے اور ان سے چشم پوشی کرے ایسے حکمران کے مسئلہ پر فتاوی عالمگیری کی مندرجہ ذیل عبارت سے روشنی پڑتی ہے۔

"اگر کوئی مسلمان تاجر امان لے کر دار الحرب میں داخل ہو تو اس پر حرام ہے کہ حربیوں کی جانوں یا مالوں سے تعرض کرے، لیکن اگر ان تاجروں کے ساتھ حربیوں کے بادشاہ نے جان بوجھ کر غدر کیا اس طور پر کہ ان کے مال لے لئے یا قید کیا یا اور کسی نے ظلم کیا اور بادشاہ نے جان بوجھ کر منع نہ کیا تو ایسی حالت میں ان تاجروں کو ان کی جانوں و مالوں سے تعرض کرنا منع نہیں ہے، مانند اس شخص کے جس کو اہل حرب قید کر کے لے گئے یا بطور چوروں کے وہ ان کے ملک میں پوشیدہ داخل ہوا کہ اس کو یہ امور مباح ہوتے ہیں، پس اسی طرح ایسے تاجروں کو بھی روا ہے کہ ان کا مال لے لے اور ان کو قتل کرے۔ (فتاوی عالمگیری)

غیر جانبداروں کا مسئلہ :

ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں ان میں اسلام اور مسلم دشمن تنظیموں، سیاسی اداروں اور دلوں کا معاملہ بالکل صاف ہے کہ انہوں نے اسلام اور مسلم دشمنی کو اپنا مقصد زندگی بنا رکھا ہے اور جو یقیناً تھوڑے ہیں، سوال یہ ہے کہ اکثریت کو کس زمرہ میں شامل کیا جائے! اور ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے اس کے جواب میں صاحب الجہاد فی الاسلام' لکھتے ہیں:۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ محاربین کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک اہل قتال دوسرے غیر اہل قتال۔ اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں یا عقلاً و عرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں جوان مرد اور غیر اہل قتال وہ ہیں جو عقلاً و عرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے یا عموماً نہیں لیا کرتے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مفلوج الاعضاء، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔ اسلام نے طبقہ اوّل کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے اور طبقہ دوم کے لوگوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا ہے ۔۔۔۔ اس باب میں اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جو اہل قتال سے ہے اس کا قتل جائز ہے خواہ بالفعل لڑے یا نہ لڑے اور ہر وہ شخص جو اہل قتال سے نہیں ہے اس کا قتل ناجائز ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ حقیقتاً لڑائی میں شامل ہو یا مقاتلین کے سے کام کرنے لگے۔

قصور وار اور بے قصور

"الجہاد فی الاسلام" سے نقل کردہ اوپر کے اقتباسات سے معلوم ہوا کہ اجتماعی ٹکراؤ اور حالت جنگ میں قصور وار اور بے قصور کی بنیاد پر تفریق نہیں کی جاتی، بلکہ جو آج نہیں کل، صبح نہیں شام، اس وقت نہیں اس وقت مقابل میں کھڑا ہو سکتا ہے ان سب کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسلامی شریعت کا یہ اصول عقل عام کے عین مطابق ہے۔ جو گروہ قصور وار اور بے قصور کی کسوٹی اپنے ہاتھ میں رکھے گا وہ ہمیشہ مار کھائے گا اور کبھی بھی اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ پھر

یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس کو بے قصور سمجھا جاتا ہے وہ بے قصور نہیں ہے، کیونکہ وہ اگر چاقو مارتا نہیں ہے تو چاقو مارنے والے کو پالتا ہے اور اس کے سپورٹ اور پشت پناہی میں رہتا ہے۔ اس طرح وہ قصور میں برابر کا شریک ہے۔ صورت واقعہ کو ایک مثال سے سمجھئے، دس ڈاکو کسی بستی پر دھاوا بولتے ہیں، ان میں سے دو کے پاس بندوق ہے وہ فائر کرتے ہیں کئی لاشیں گر پڑتی ہیں، پھر اگر اس ٹولی کے کچھ افراد بستی والوں کی زد میں آجاتے ہیں تو کیا ان کے لئے ضروری ہوگا کہ کوئی اقدام کرنے سے پہلے یہ تحقیق کریں کہ آیا فائرنگ کرنے والے یہی لوگ ہیں، ظاہر ہے یہ تحقیق کبھی بھی نہ ہوسکے گی اور بالآخر روزانہ ان کے حصہ میں ڈاکہ زنی آئے گی۔ ہاں یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہر حالت میں قصوردار اور بے قصور کی تفریق کئے بغیر نشانہ بنانا کوئی فرض اور واجب نہیں ہے بلکہ محض جائز ہے، بشرطیکہ اپنے تحفظ اور دفاع کا تقاضا ہو اور اس کا دار و مدار اقدام کرنے والے کی اختیار تمیزی پر ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب۔

(کتابت: محمد شفیع الدین)